خود نوشت "یہ بازی عشق کی بازی ہے" کے سیاسی و سماجی مناقشات

The political and social discussions of the Autobiography "Ye Bazi Ishq Ki Bazi

ڈاکٹر عرفان توحید
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، لیڈز یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر پروین اختر کلو
ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

Abstract:

Farkhunda Bukhari's autobiography "Ye Bazi Ishq Ki Bazi Hai" is a book full of political and social contexts and debates in the 21st century. In the autobiography under discussion, the author describes the sufferings of Hindu Muslim riots and migration before the establishment of Pakistan in a painful way. The author becomes somewhat saddened by comparing the current social situation of Pakistan with the social and cultural life of her childhood. According to the author, the political and social structure of the country has been paralyzed due to the internal and external forces that have disrupted the democratic process due to the political instability of Pakistan and various periods of martial law.

Political interests and military dictators have harmed the interests of the country for the sake of their personal interests in every era. This is the reason why the overall lack of educational resources in our country, ineffective planning, unemployment, kidnapping for ransom, terrorism, hyperinflation, social unrest, linguistic discrimination and regional prejudices have become the fate of Pakistan. Scribe has tried to present the analysis of these problems and events in a research and critical manner in the article under study.

کلیدی الفاظ: فرخندہ بخاری، عنائت اللہ مشرقی، جنگ ستمبر 1965، شملہ معاہدہ، ذوالفقار علی بھٹو، لاہور

فرخندہ بخاری کی رودادِ حیات "یہ بازی عشق کی بازی ہے" اکیسویں صدی میں منظر عام پر آنے والی سیاسی و سماجی تناظرات اور مناقشات سے بھرپور آپ بیتی ہے۔ زیرِ بحث خود نوشت کے آغاز میں مصنفہ نے قیامِ پاکستان سے قبل ہندو مسلم فسادات، ہجرت کے مصائب کو پُر درد انداز میں بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں مصنفہ نے پاکستان کی موجودہ سیاسی و سماجی صورتِ حال کے بارے میں بھی حقائق پر مبنی تجزیات پیش کیے ہیں۔ خود نوشت کے بارے میں آپ بیتیوں کے تجزیہ نگار ڈاکٹر پرویز پروازی نے اس سرگذشت کی اشاعت کے فوری بعد یہ پیشین گوئی کی تھی جو کہ بعد میں بالکل درست ثابت ہوئی ہے :"سادہ لفظوں میں لکھی گئی یہ خود نوشت اپنی سادگی اور خلوص کی وجہ سے قارئین کے دلوں میں جگہ پائے گی۔"(۱)

مصنفہ پاکستان کے سیاسی و سماجی نشیب و فراز کے حوالے سے اپنے بچپن کے دور کی سماجی و تہذیبی زندگی سے موازنہ کرتے ہوئے کسی قدر رنجیدہ ہو جاتی ہیں۔ ان کے نزدیک پاکستان کے سیاسی عدم استحکام اور مارشل لاء کے مختلف ادوار سے جمہوری عمل میں رخنہ انداز ہونے والی اندرونی و بیرونی قوتوں کے سبب وطنِ عزیز کا سیاسی و سماجی ڈھانچہ مفلوج ہو کر رہ گیا۔ سیاسی مفاد پرستوں اور فوجی آمروں نے ہر دور میں اپنے ذاتی مفادات کی خاطر ملکی مفادات کو گزند پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں مجموعی طور پر تعلیمی وسائل کا فقدان، غیر موثر منصوبہ بندی، بے روزگاری، مہنگائی، اغوا برائے تاوان، راہ زنی، دہشت گردی، افراطِ زر، معاشرتی بدامنی، لسانی امتیازات اور علاقائی تعصبات ایسے مسائل ملکِ پاکستان کا مقدر بن چکے ہیں۔ راقم نے زیرِ مطالعہ مضمون میں انھی مسائل وواقعات کا تحقیقی و تنقیدی انداز میں تجزیہ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

۲۷۲ صفحات کو محیط زیر نظر آپ بیتی کو فرخندہ بخاری نے ۱۳۴ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ مصنفہ کے آباؤاجداد کشمیر کے رہنے والے تھے، جو سری نگر سے امرتسر پہنچے، کچھ عرصہ وہاں قیام کیا۔ امرتسر میں حالات خراب ہوئے تو اندرونِ لاہور کی ایک معروف گلی کاغذیاں میں رہائش پذیر ہو گئے۔ ان کے والد میونسپل کمیٹی میں لیٹی گیشن آفیسر کے عہدے پر تعینات تھے اور ان کے دادا پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔ مصنفہ کو بچپن میں عملی سیاست سے آشنائی اس طرح ہوئی کہ اس دور میں ان کے والد کی بہنوں اور ان کے بیٹوں نے علامہ عنایت اللہ مشرقی کی خاکسار تحریک میں باقاعدہ رکنیت حاصل کی تھی اور تحریک میں فعال کارکن کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دینا شروع کیں۔ ان دنوں خاکسار تحریک

کے کارکنان کی خاکی وردیاں ہوتی تھیں اور ہاتھ میں بیلچے لیے چاک و چوبند دستے خوش نما معلوم ہوتے تھے۔ تحریکِ آزادی اور اپنے جائز حقوق کے حصول کی خاطر انگریز دور میں ان کی پھوپھیاں اور ان کے بیٹے حوالات میں قید کاٹ چکے تھے۔ مصنفہ خود نوشت کے آغاز میں اپنے بارے میں رقم طراز ہیں:

"آپ بیتی لکھنا۔۔۔اور وہ بھی ایک بالکل گھریلو قسم کی عورت کے لئے بہت ہی مشکل بلکہ بعض اوقات بہت ہی دشوار کام ہے۔ مزید یہ کہ جب اس عورت کا تعلق میرے جیسے نچلے درجے کے متوسط طبقے سے ہو جس کے باپ، دادا کے پاس ایسا کوئی خطاب نہ ہو جو حکومت سے عنایت ہوا ہو مثلاً سر، خان بہادر، خان صاحب، ممبر برٹش ایمپائر۔نہ فرنگی ہی اس خاندان کو فرنگیوں کی طرف سے وسیع اراضی، نقد جاگیر، کوٹھی، بنگلہ یا اعزازی عہدہ اور اس کے ساتھ خلعت اور انعام ملا ہو۔نہ ہی خود یہ عورت امیر، وزیر، بڑی سیاسی راہنما ہو بلکہ جو کسی پارٹی کی ادنی کارکن بھی نہ رہی ہو۔۔۔اور تو اور کوئی ادیب یا شاعر بھی نہ ہو۔۔۔اور پھر یہ کام عمر کے آخری حصے میں کیا جائے جس مرحلے پر بڑے بڑے ادیبوں کے قلم بھی تھک گئے ہوتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بھی کوئی عار نہیں کہ میں کوئی پیدائشی لکھاری نہیں۔"(۲)

مصنفہ پاکستان کی موجودہ سیاسی و سماجی صورتِ حال کے بارے میں لکھتی ہیں کہ وہ سیاسی تجزیات نہ پہلے کرتی تھیں اور نہ ہی کبھی دانشورانہ قسم کا اظہارِ خیال کیا تھا(۳) لیکن آپ بیتی کا بغور جائزہ لیا جائے تو بآسانی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک منجھی ہوئی سیاسی کارکن تھیں۔

آپ بیتی میں قیام پاکستان کے دوران ہندو مسلم فسادات اور ہجرت کے مصائب کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان دنوں لاہور چھاؤنی کے علاقے میں دو کیمپ والٹن اور باؤلی بنائے گئے تھے۔ بھارت سے آنے والی ریل گاڑیوں میں مہاجرین کو راستے میں قتل کر دیا جاتا تھا۔ مصنفہ کی والدہ، خالائیں اور پھوپھیاں جو کہ خاکسار تحریک کی کارکن تھیں۔ والٹن کیمپ میں زخمی مہاجرین کی تیمارداری کرنے کے لیے باقاعدگی سے جایا کرتی تھیں۔ اس کیمپ میں دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کو مہاجرین کی ریل گاڑی میں لایا گیا، جن کی عمریں محض چند دن یا ماہ کی تھیں۔ واضح رہے کہ ان بچوں کو مصنفہ کے خاندان نے لاوارث سمجھ کر اپنے کنبے کا حصہ بنالیا تھا۔

آپ بیتی میں پاک بھارت جنگ کے بارے میں تحریر ہے کہ فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں ستمبر ۱۹۶۵ء میں جنگ کا باقاعدہ آغاز لاہور پر بھارتی حملے سے ہوا۔ عوام کو اس جنگ سے یہ اُمید تھی کہ شاید اب مسئلہ کشمیر حل ہونے والا ہے۔ جنگ کے بعد اعلانِ تاشقند نے عوام میں ایک سیاسی طور پر

بے چینی پیدا کر دی تھی حالانکہ عوام اٹھارہ سال سے جاری کشمیر کے تنازعے کے مستقل حل کی خواہش مند تھی۔ اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے اقوام متحدہ میں ایک پر جوش تقریر کی اور بعد میں اعلانِ تاشقند کے اعلان پر اُنھوں نے حکومت سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان دنوں ایوب خان کی حکومت کے خلاف سیاسی جماعتیں اتحاد پر رضامند ہونے لگی تھیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کر کے روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمن کی عوامی لیگ کو زیادہ نشستیں حاصل ہوئیں، پنجاب میں پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی۔ مجیب الرحمن نے چھ نکات پیش کیے۔ جبکہ جنرل یحییٰ خان اور ان کے ساتھیوں نے اقتدار کے لالچ میں اس سیاسی بحران کو مزید ہوا دی۔ ۱۹۷۱ء میں جنرل یحییٰ خان نے اس مسئلہ کا سیاسی حل ڈھونڈنے کے بجائے فوجی طاقت کے استعمال کو ترجیح دی اور مشرقی پاکستان پر طاقت کا استعمال کیا۔ حالانکہ بنگالیوں نے تحریک پاکستان اور قیام پاکستان میں بہت زیادہ قربانیاں دی تھیں۔ اہلِ بنگال نے مسلم لیگ کے قیام، انگریز حکومت کے خلاف سراج الدولہ کی جنگ، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بے مثال کردار، بنگال کی تقسیم ۱۹۰۵ء کی بھرپور حمایت، ہندوستان میں مسلم لیگ کی پہلی صوبائی حکومت کا بنگال میں قیام اور ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک حب الوطنی کی قیمت ادا کی۔ ان سب عوامل کے بعد جب بنگالیوں نے اقتدار میں آنے کے لیے اکثریت حاصل کر لی تو مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کو یہ گوارا نہیں تھا کہ مشرقی پاکستان سے کوئی ان پر حکومت کرے۔ جنرل یحییٰ خان نے فوجی قوت سے طلبا، اساتذہ اور عام عوام پر دھاوا بول دیا۔ پاکستانی فوج کی طرف سے اس آپریشن نے ہندوستانی سیاسی قیادت کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ یہ ثابت کر سکے کہ محض مذہب مسلمانوں کو متحد نہیں رکھ سکتا۔ مسلمان حکمرانی کے قابل نہیں ہیں۔ نظریہ پاکستان کا کوئی وجود باقی نہیں رہا اور مسلم عسکری طاقت جس کی تاریخ گواہ ہے ختم ہو چکی ہے۔

مصنفہ بیان کرتی ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو نے ان نازک سیاسی حالات میں اقتدار سنبھالا تو سب سے پہلے بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے مذاکرات کے ذریعے نوّے ہزار پاکستانی جنگی قیدیوں کو آزاد، بھارتی مقبوضہ علاقوں کو واگزار کرانے کے لیے شملہ معاہدہ کر لیا۔ قوم کو مایوسی سے نکالنے کے عملی اقدامات کیے، اسلامی سربراہی کانفرنس کا لاہور میں انعقاد، مسلم ممالک کے اتحاد کی بنیاد رکھی گئی، موثر

اور متفقہ ۱۹۷۳ء کا آئین بنایا گیا، صنعتی اور زرعی اصلاحات کا آغاز، نظام تعلیم میں اصلاحات اور نیوکلیئر پروگرام کی بنیاد ایسے احسن اقدامات کیے تھے۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات سے پہلے ملک میں سیاسی جماعتوں نے مل کر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف پی این اے نامی سیاسی محاذ قائم کیا۔ اس میں مفتی محمود، مولانا مودودی، مولانا نورانی، نوابزادہ نصر اللہ اور پیر پگاڑا شامل تھے۔ ملک کے طول و عرض میں نظام مصطفی کے نفاذ کے لیے ان دنوں خوب مہم چلائی جاتی رہی۔ مصنفہ نے انھی انتخابات میں عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا، انتخابات کے دن حق رائے دہی کے لیے جس پولنگ سٹیشن پر گئیں وہاں پر پیپلز پارٹی کی پولنگ ایجنٹ کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دیتی رہی بالآخر اس حلقے سے پیپلز پارٹی کے امیدوار کامیاب قرار پائے تھے۔ سیاسی اتحاد پی این اے نے نتائج دیکھ کر صوبائی انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان اس لیے کر دیا کہ انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلی ہوئی ہے اور انتخابات دوبارہ فوج اور عدلیہ کی نگرانی میں کروائے جائیں۔ انتخابات کے بعد سیاسی جماعتوں کے درمیان مذاکرات ہوتے رہے۔ بالآخر پیپلز پارٹی اور پی این اے کا معاہدہ ہونے والا تھا کہ جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء اور نوّے دن میں انتخابات کروانے کا اعلان کر دیا۔

آپ بیتی میں ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کو عالمی سازش قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ضیاء الحق نے نوّے دن کے بعد انتخابات کو اس لیے ٹال دیا تھا کہ اگر دوبارہ ذوالفقار علی بھٹو کو الیکشن کا موقع مل گیا تو اس کا مقابلہ کون کرے گا۔ امریکا چوں کہ پہلے سے مسلم ممالک کے وسائل کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس تاڑ میں تھا کہ انھیں آپس میں لڑوا کر ان کے وسائل کو حاصل کر سکے۔ امریکا کبھی نہیں چاہتا تھا کہ تمام مسلم ممالک کے سربراہان کے درمیان اتفاق و اتحاد پیدا ہو۔ سامراجی طاقتوں کا اس دور میں ایک واضح مقصد یہ تھا کہ کسی طرح بھٹو کو ختم کروا دیا جائے تاکہ پاک چین دوستی کو مزید آگے بڑھنے سے روک دیا جائے اور اگر پاکستان ایٹم بم بنانے میں کامیاب ہو گیا تو بھارتی ایٹمی بالادستی کا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔

لاہور ہائی کورٹ میں جب بھٹو کے مقدمہ کی سماعت روزانہ کی بنیاد پر کی جا رہی تھی تب مصنفہ کو پتہ چلا کہ ان دنوں بیگم نصرت بھٹو گلبرگ میں قیام پذیر ہیں۔ وہاں سے بیگم بھٹو کے ہمراہ انھیں قذافی سٹیڈیم میں کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے لایا گیا تو عوام نے پیپلز پارٹی اور بھٹو کے حق میں نعرے لگانے شروع کر دیے تھے۔ پولیس نے لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج کیا تو نصرت بھٹو کا لاٹھی لگنے

سے سر پھٹ گیا تھا۔ اس لاٹھی چارج اور بھٹو کی گرفتاری کے خلاف مصنفہ اور ان کی چند ساتھی خواتین نے مال روڈ کی مقررہ جگہ پر احتجاج کرنا شروع کر دیا تھا۔ خفیہ پولیس نے احتجاج کرنے والی خواتین کے گھروں کی باقاعدہ نگرانی کا آغاز کر دیا تھا۔ ان دنوں مقامی سطح پر ''بھٹو بچاؤ کمیٹی'' کا قیام عمل میں لایا گیا، پمفلٹ اور بینرز کو لکھوایا جاتا، جلسے جلوسوں کے اخراجات کو پورے کرنے کے لیے ٹوکن پر چیاں چھپوائی گئیں، پیپلز پارٹی کے عہدے داروں نے احتجاج کے لیے فنڈز دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم مصنفہ نے بھٹو بچاؤ کمیٹی کے فنڈ میں اپنی سونے کی چوڑیاں اور پانچ سو روپے جمع کروا دیے تھے۔

احتجاجی تحریک کی ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے مصنفہ کو جلد گرفتار کر کے کوٹ لکھپت میں قید کر دیا گیا۔ اسیر خواتین کی جامہ تلاشی کے بعد طبی معائنہ کروایا گیا۔ اتفاق سے اسی جیل میں بھٹو کو بھی پاگلوں کے سیل کے پاس رکھا گیا تھا۔ مخبوط الحواس لوگوں کے سیل کے ساتھ رکھے جانے کی بھٹو نے شکایت بھی کی تھی، لیکن آمر انھیں نفسیاتی طور پر بھی ٹارچر کرنا چاہتا تھا۔ ان عوامل کے ساتھ ساتھ جیل میں بھٹو کے ساتھ اور بہت سے حربے بھی آزمائے جاتے رہے کیوں کہ ان کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے راولپنڈی کے راجہ بازار میں کھلے عام ہنری کسنجر کا دھمکی بھرا خط لہرایا، جس میں بھٹو سے کہا گیا تھا کہ پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کا ارادہ ترک کر دو، اگر تم اس کام سے باز نہ آئے تو تمھیں عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا۔

بھٹو کی اسیری کے دور میں پیپلز پارٹی میں صرف دو طبقوں کے لوگ رہ گئے تھے، ایک مزدور اور دوسرے نچلے متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے تھے۔ اس دور میں بہت سے موقع پرست سیاست دان اپنا مال و اسباب محفوظ کرنے کی فکر میں تھے، صرف غریب عوام اپنے پر خلوص جذبات کے ساتھ ذوالفقار علی بھٹو کے ہم نوا تھے۔ ان دنوں صحافیوں اور عام سیاسی کارکنان کو کوڑے مارے جانا معمول کی بات تھی۔ بالآخر ۴/ اپریل ۱۹۷۹ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی اور ان کے پسماندگان کو ان کے آخری دیدار سے بھی محروم رکھا گیا تھا۔ بھٹو کو پھانسی دیے جانے پر پی این اے میں شامل سیاسی جماعتوں کے بعض اراکین نے مٹھائی بانٹی اور پیپلز پارٹی کے نام ور کارکنان کے گھر بھی مٹھائی بھجوائی گئی تھی۔

مصنفہ کے مطابق جنرل ضیاء الحق کو امریکا نے روسی افواج کے خلاف افغانستان میں جہاد کا ٹھیکہ دے دیا تھا۔ اصل میں امریکا افغانستان میں جو کھیل کھیلنا چاہتا تھا، وہ کھیل شاید وزیر اعظم ذوالفقار

علی بھٹو کی حکومت انھیں کبھی نہ کھیلنے کی اجازت دیتی، اس لیے امریکا کو پاکستان میں امریکا نواز حکومت کی اشد ضرورت تھی۔ فرخندہ بخاری کے شوہر اپنی خود نوشت میں ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت اور ان کی سیاسی بصیرت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> " ذوالفقار علی بھٹو محض سیاسی رہ نما نہیں ہے۔ اس نے ہمیں دوبارہ جنم دیا تھا۔ اس نے ایک نیا پاکستان تعمیر کیا تھا اور اپنی تمام انسانی فطری کمزوریوں کے باوجود وہ پاکستان کی علامت ہے اور جب کسی قوم کی علامت اس سے چھین لی جائے تو اس قوم کو اپنے منطقی نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ "(۴)

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد مصنفہ کا گھر پیپلز پارٹی کی خواتین کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اس سیاسی جدوجہد کے دور میں ان کی ملاقات کنیز یوسف جو کہ کسی یونیورسٹی میں وائس چانسلر رہ چکی تھیں۔ انھوں نے ایک اجلاس میں کہا کہ پاکستان میں آزادیِ اظہار پر قدغن لگا دی گئی ہے اس لیے کارکنان کو چاہیے کہ وہ ترکی میں سیمینار منعقد کر کے اپنے سیاسی مطالبات کو دوسرے ملکوں کے لوگوں تک پہنچائیں۔ کنیز یوسف کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ فرخندہ بخاری پیپلز پارٹی کی شیدائی ہے اور بھٹو کے نام پر کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار ہے۔ بالآخر مصنفہ نے ترکی میں سیمینار میں شرکت کے لیے رضامندی ظاہر کر دی تو دو دن میں ان کا پاسپورٹ بنوا دیا گیا۔ کنیز یوسف نے مصنفہ کو اسلام آباد ایئرپورٹ پر تسلی دی کہ استنبول ایئرپورٹ پر ان کا بھائی بریگیڈیئر عثمان خالد ان کو ملے گا۔ ترکی میں چند روز گزارنے کے بعد انھیں لیبیا میں لیکچرز سننے کے لیے بھجوا دیا گیا۔ مصنفہ نے ان لوگوں کی غلط بیانی پر برہمی کا اظہار کیا، لیکن اب ان کے پاس لیبیا جانے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ لیبیا میں قیام کے دوران پاکستانی سیاسی وفد کو لیکچرز دیے گئے۔ آخری لیکچر لیبیا کے صدر قذافی نے پیپلز ہال میں دیا تھا۔ ان لیکچرز کے چند روز بعد مصنفہ واپس پاکستان پہنچ گئیں۔

مصنفہ کو وطن واپسی پر گھر سے فوجیوں نے یہ کہہ کر گرفتار کر لیا کہ معمولی سی انکوائری کے بعد انھیں واپس چھوڑ دیا جائے گا۔ فوجیوں نے مصنفہ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور ہاتھوں کو بھی باندھے رکھا۔ وہاں پر چھ فوجی افسران نے انھیں کہا کہ آپ ہمیں لکھ کر دیں کہ آپ کو بیگم نصرت بھٹو نے لیبیا بھیجا تھا۔ اس کے بدلے میں انھیں ہر طرح کی مالی معاونت فراہم کی جاتی رہے گی۔ مصنفہ نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا تو ان پر تشدد کیا جاتا رہا، لیکن ان کا عزم اور حوصلہ میں کمی نہ آنے پائی۔ آپ نے دورانِ اسیری بھوک ہڑتال کر دی، جس کی وجہ سے نقاہت بڑھنے لگی تو خاکی وردی میں ملبوس ڈاکٹر کو چیک اپ

کے لیے بلوایا گیا، جس کے اصرار کرنے پر مصنفہ نے بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ بالآخر ایک مسافر بردار ہوائی جہاز کو ہائی جیکروں نے اغوا کر لیا اور پیپلز پارٹی کے اسیر ان کی رہائی کا فوری مطالبہ کر دیا جس پر قیدیوں کو بذریعہ ہوائی جہاز دمشق پہنچایا گیا۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد کچھ لوگوں کو لیبیا بھیج دیا گیا تھا۔ یہاں سے مصنفہ کو بڑی تگ و دو کے بعد انگلینڈ کے لیے روانہ کر دیا گیا۔

فرخندہ بخاری کے خاوند شہرت بخاری ان دنوں اسلامیہ کالج سول لائن سے ریٹائرمنٹ حاصل کر کے انگلستان روانہ ہو گئے تھے۔ انھیں کو مشرقی لندن میں، ہیکنی کے علاقے میں سیاسی پناہ گزینوں کے طور پر حکومت کی طرف سے ایک مکان دیا گیا تھا۔ مکان چوتھی منزل پر آخری فلیٹ تھا، جس کی حالت انتہائی خراب تھی، آہستہ آہستہ اس فلیٹ کو رہنے کے قابل بنایا گیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد مصنفہ کو معلوم ہوا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو لندن آنے کی اجازت مل گئی ہے۔ لہٰذا انھوں نے لندن پہنچنے پر محترمہ بے نظیر سے ملاقات کی۔ پہلی ملاقات کے بعد باقاعدہ ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ بی بی نے انگلستان میں پیپلز پارٹی کی تنظیم سازی پر وقت صرف کیا۔ وہ برطانوی میڈیا کے انٹرویوز میں اپنی تکالیف کو کم اور کارکنان کے مصائب کا زیادہ ذکر کرتی تھیں۔ انھوں نے لندن میں منظم جلسے کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس پر بھرپور عمل کا آغاز کر دیا تھا۔ فرخندہ بخاری آپ بیتی میں محترمہ بے نظیر کی عملی سیاسی تربیت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''محترمہ بے نظیر کی ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی میں سیاسی کام اور تربیت شروع ہو گئی تھی۔ بھٹو صاحب کو اپنی اولاد میں محترمہ بے نظیر کے اندر سیاست کے زیادہ جوہر نظر آئے اسی لیے وہ شملہ کے مذاکرات میں چھوٹی سی بے نظیر کو ساتھ لے کر گئے تھے۔ دراصل وہ بے نظیر کی تربیت کر رہے تھے۔ اسی معاہدے کے تحت ۹۰ ہزار جنگی قیدی اور بہت سا علاقہ اندرا گاندھی نے واپس کیا تھا۔ وہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔''(۵)

شاہ نواز بھٹو کی اچانک موت پر بی بی کو اپنے بھائی کی تدفین کے لیے وطن واپس آنا پڑا تو تدفین کے بعد بی بی کو نظر بند کر دیا گیا۔ وزیر اعظم جونیجو کے دور میں پاکستان کے سیاسی حالات میں مثبت تبدیلی آنا شروع ہو گئی تھی۔ بالآخر جونیجو نے مارشل لاء کو باقاعدہ اُٹھانے کا اعلان کر دیا۔ بیرونی دنیا کے دباؤ میں آ کر بی بی کی نظر بندی ختم کر دی گئی اور وہ لندن پہنچ گئیں۔ واپس آ کر ان کی سیاسی حکمت عملی بدل چکی تھی۔ انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ پاکستان کے سیاسی افق پر ظلم و جبر کے بادل جلد چھٹنے والے ہیں۔ بی بی کا لندن سے لاہور ایئرپورٹ پہنچنے پر فقید المثال استقبال کیا گیا اور مینار پاکستان پر انھوں نے ایک کام یاب

جلسہ کیا۔ بی بی نے پاکستان آ کر زبردست سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا، اس میں انھیں کام یابی ملی اور بالآخر محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان کی پہلی خاتون وزیر اعظم بن گئیں۔ مصنفہ بھی آٹھ سالہ جلاوطنی کے بعد وطن واپس لوٹ آئیں۔

فرخندہ بخاری نے آپ بیتی میں ''سیاست سے علیحدگی'' کے باب میں تحریر کیا ہے کہ آٹھ سالہ جلاوطنی کے مصائب جھیل کر جب واپس آئیں تو ان کی بڑی عزت افزائی کی گئی۔ مصنفہ کو کئی سیاسی و سماجی تقریبات میں بطور خاص مدعو کیا جاتا رہا، ان کے انٹرویوز کو اخبارات میں نمایاں جگہ دی جاتی رہی، لیکن ان کے گھریلو حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ وہ مزید سیاسی معاملات میں خود کو نہ اُلجھائیں۔ بی بی نے گورنر ہاؤس لاہور میں فرخندہ بخاری کو خواتین کی وزارت دینے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا، لیکن ان کے شوہر شہرت بخاری اس بات پر رضامند نہ ہوئے اور انھیں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا مشور دیا۔ اس دوران بی بی نے پیغام بھجوایا کہ وہ عدالت سے اپنے کیس کا فیصلہ کروائیں۔ مصنفہ نے سلیم سہگل کو وکیل کر کے کیس کی پیروی کی اور جلد عدالت سے باعزت بری ہو گئیں۔ فرخندہ بخاری کی خودنوشت اور ان کے مصائب و آلام کے بارے میں شاہد ندیم لکھتے ہیں:

> ''فرخندہ کے بیان میں سچائی اور سادگی ہے اسے سنگدل فوجی آمروں پر غصے سے زیادہ ترس آتا ہے اپنی معصومیت اور جوش کو اپنے سیاسی یا ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرنے والوں کے لیے اس کے پاس نفرت کی بجائے درویشانہ درگزر ہے۔''(۶)

فرخندہ بخاری اپنے بڑے بھائی افتخار الحق کے بارے میں لکھتی ہیں کہ وہ ان کے نزدیک ایک بھائی سے زیادہ ایک استاد، دوست اور راہ نما تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انھوں نے بی۔ اے آنرز کیا اور ایئر فورس میں بطور سائفر اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانہ طالب علمی کے دوران ہی ان کے خیالات کمیونسٹ پسند تھے۔ وہ چاہتے تھے معاشرے میں امیر اور غریب کے فرق کو مٹا دینا چاہیے۔ ان دنوں ان کا زیادہ میل ملاپ تنویر نقوی، وحید فاطمی، شورش کاشمیری، ظہیر کاشمیری اور چند دوسرے ساتھیوں سے رہا تھا۔ ملازمت ملنے کے بعد بھی جب وہ چھٹیوں پر گھر آتے تو ان کے دوست زیادہ تر ارسطو، کارل مارکس، لینن، پشکن اور اشتراکیت کے حوالے سے ہی باتیں کرتے رہتے تھے۔ مصنفہ اپنے بھائی اور پھوپھو کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''پھوپھو جی اور بھائی جان افتخار جیسے لوگ اقلیت میں سہی مگر باضمیر انقلابی، معاشرے کی اصلاح کرنے کے لیے ہوتے ضرور ہیں۔ لوگوں میں مقبول ہوں یا نہ ہوں، بڑے مناصب پر فائز ہوں نہ

ہوں، اور ہوں بھی کیسے کہ وہ تو اپنے ضمیر کے قیدی ہوتے ہیں ناانصافی ہوتے نہیں دیکھ سکتے، حق کے لیے آواز بلند کرتے ہیں۔"(۷)

کچھ عرصہ بعد فرخندہ بخاری کے بھائی افتخار الحق کو پنڈی سازش کیس میں گرفتار کر لیا گیا، کیوں کہ انھوں نے خفیہ طور پر پمفلٹ چھاپنے کی مشین لگا رکھی تھی۔ وہاں پر فوج کے چھاپے سے پہلے اطلاع دے دی گئی۔ لہٰذا آپ کے تمام ساتھی فرار ہونے میں کام یاب ہو گئے، لیکن مشینیں بر آمد کر لی گئی تھیں۔ فوج کی طرف سے مزید تحقیق کرنے پر یہ ثابت ہو گیا کہ پمفلٹ پر لکھائی افتخار الحق کی تھی۔ فوج کے قواعد کے مطابق ان کا کورٹ مارشل کیا گیا اور کئی کمیونسٹوں کو گرفتار کر لیا گیا، جن میں فیض احمد فیضؔ، سجاد ظہیر، میجر جنرل اکبر خاں، بریگیڈیئر صادق خان، کرنل ضیاء، میجر حسن، بیگم اکبر خان اور ان کے کئی ساتھیوں پر بعد میں حکومت کے خلاف بغاوت کرنے پر سزائے موت سنا دی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد مصنفہ کے گھر والوں کو خبر ملی کہ افتخار الحق کے ساتھیوں نے انھیں جیل کی سلاخیں کاٹ کر آزاد کروا کر روپوش کر دیا تھا۔

آپ بیتی میں مصنفہ قائداعظم محمد علی جناح کے بارے میں لکھتی ہیں کہ انھوں نے لنکنز ان سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کر کے بمبئی میں پریکٹس کا آغاز کر دیا۔ ان دنوں اسمبلیوں میں جاگیرداروں، سیٹھ، نواب اور سرداروں کی اکثریت تھی لہٰذا قائداعظم کو وقتی طور پر سیاسی میدان میں اسی قسم کے اراکین اسمبلی کا سہارا مجبوراً لینا پڑا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کے حصول کے لیے قائداعظم نے بھرپور مساعی سے کام کیا اور بنگال میں مسلم لیگ کی مخلوط وزارت بن گئی۔ بعد میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات نے اپنے مفادات کی خاطر قائداعظم کی سیاسی حیثیت کو قبول کر لیا۔ مسلم لیگ کی کوششوں سے ۱۹۴۳ء میں سندھ اسمبلی میں مسلمانوں کی الگ آزاد ریاست کے حق میں قرارداد کو منظور کر لیا گیا تھا۔ بعد میں وہ فیصلہ کن مرحلہ آیا جب ۱۹۴۶ء کی مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ نے تمام نشستیں جیت کر سیاسی میدان مار لیا تھا، اس وقت کانگریس اور انگریز حکومت کے لیے کوئی جواز باقی نہ رہا کہ وہ مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی ایک غیر نمائندہ جماعت کہہ کر نظر انداز کر سکیں۔

قائداعظم نے جاگیرداروں سے بارہا کہا کہ انھیں غریب پروری کرنی چاہیے اور ایک روایتی غریب دشمنی کی روش کو جلد ختم کر دینا چاہیے کہ غریب مزارعوں کے معاشی حالات بہتر ہو سکیں۔ انھوں نے یہ بھی باور کروایا کہ اگر غریبوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھا جاتا رہا تو وہ بزور اس نظام

کو بدل کر رکھ دیں گے اور اگر وہ ظالمانہ جاگیر داری نظام کو ختم نہ کر سکے تو انھیں ایسا پاکستان منظور نہیں ہے۔ ان مقاصد کے حصول کی خاطر مسلم لیگ نے ۱۹۴۴ء میں اپنے انتخابی منشور میں اس بات کا واضح اعلان کر دیا کہ وہ جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس انقلابی منشور کی بدولت نہ صرف نچلے طبقے کے عوام، بل کہ کمیونسٹ یا تبدیلی پسندوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ مصنفہ اس حوالے سے آپ بیتی میں لکھتی ہیں:

> ''قائد اعظم نے اس نظام زمینداری، وڈیرہ شاہی اور نوکر شاہی کو توڑنے کے لیے علامہ اقبال کی استعمال کردہ اصطلاح ''اسلامی سوشلزم'' کے نفاذ کی بات کی اور زوردار آواز میں مشرق و مغرب دونوں حصوں میں سر عام کی۔''(۸)

آپ بیتی میں مصنفہ کا کہنا ہے کہ قائد اعظم کے اسلامی سوشلزم کے اصول کو ان کی وفات کے بعد حکمرانوں نے فراموش کیے رکھا۔ ان حکمرانوں میں لیاقت علی خان، فیروز خان نون، حسین شہید سہروردی، ایوب خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف شامل تھے۔ قائد اعظم کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے جب نئی سیاسی جماعت پیپلز پارٹی کا منشور مرتب کیا تو چار بنیادی اصولوں میں ایک اصول ''اسلامی سوشلزم'' کو بطور خاص شامل کیا گیا تھا۔ یہ بلاشبہ ایک انقلابی منشور تھا، جس میں سر سکندر حیات کے بیٹے سردار شوکت حیات نے ۱۹۷۵ء میں پیپلز پارٹی میں یہ کہہ کر شمولیت اختیار کر لی تھی کہ پیپلز پارٹی کا وہی منشور ہے جو کہ ۱۹۴۴ء میں کبھی مسلم لیگ کا منشور ہوا کرتا تھا۔

مصنفہ کے خیال میں ذوالفقار علی بھٹو کا قصور یہ تھا کہ وہ سامراجی نظام کے خلاف تھے اور غریب عوام کو خوش حال دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک خطے میں توازن کو برقرار رکھنے کے لیے بے حد ضروری تھا کہ پاکستان ایٹمی قوت بن کر اُبھرے۔ دوسرا ان کا مقصد یہ تھا کہ ایٹمی توانائی کے استعمال سے پاکستان میں خوش حالی لائی جائے۔ دراصل اس دور میں سرمایہ دارانہ اور کمیونسٹ دنیا میں ایٹم بم تیار کر لیے گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بھارت اور اسرائیل نے ایٹمی طاقت کے حصول کے لیے اپنی کوششوں کو تیز کر دیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جب اس صورتِ حال کا اندازہ لگایا تو انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ پاکستان ایٹمی قوت بن کر دکھائے گا چاہے قوم کو گھاس ہی کیوں نہ کھانی پڑ جائے۔ مغربی ممالک کی ایماء پر ۱۸ مئی ۱۹۷۴ء کو بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا تاکہ پاکستان اور چین کو خبردار کر سکے۔

بھٹو نے ایٹمی طاقت کے حصول کے لیے ایٹمی سائنس کمیشن کی از سر نو تشکیل کا آغاز کیا، بیرون ملک سے پاکستانی ایٹمی سائنس دانوں کو وطن واپس لایا گیا، ایٹمی سائنس دانوں نے اپنے ملکی مفادات کو ذاتی مفادات پر ترجیح دے کر بے لوث محنت کا آغاز کر دیا، عربوں نے وسائل فراہم کرنا شروع کر دیے، بے شمار پاکستانی طلبا کو ایٹمی سائنس کی تعلیم کے حصول کے لیے بیرون ملک بھجوایا گیا اور بالآخر بھٹو کے جذبے نے ناممکن کو ممکن بنا کر دکھا دیا۔ بھٹو ایٹمی قوت کو حاصل کرنے میں اتنے کامیاب ہونے لگے کہ امریکا نے اپنے وزیر خارجہ ہنری کسنجر کو دھمکی دینے کے لیے بھیجا کہ اگر آپ ایٹم بم کے حصول سے باز نہ آئے تو آپ کا انجام عبرت ناک ہو گا۔ بھٹو نے اس دھمکی کے جواب میں کہا کہ ایک آزاد ملک کے وزیر اعظم سے اس طرح کا انداز تکلم انتہائی غیر شائستہ ہے اسے برداشت نہیں کیا جائے گا۔ فرخندہ بخاری اپنی روداد حیات میں پاکستانی داخلی معاملات، بدامنی اور نیوکلیر پروگرام میں امریکی مداخلت کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ”آج کا پاکستان کسمپرسی میں سسک رہا ہے۔ امریکا ہمارے نیوکلیر پروگرام کو جسے بھٹو نے اپنے خون سے بنایا تھا، جسے بے نظیر نے جان کی بازی لگا کر مکمل کیا تھا۔ آج امریکا دھمکیاں دے رہا ہے کہ پاکستانی حکمران اس کی حفاظت ہی نہیں کر سکتے۔ وہ امریکا جو پاکستان کا کبھی دوست نہ بن سکا۔ ہمیشہ پاکستان کو دھوکہ دیا۔ اسے معلوم ہے کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والوں کو اس نے مرواڈالا ہے اب کون اس کو روکے گا کوئی نہیں! وہ چند ڈالرز کے طفیل پورے پاکستان پر چھا چکا ہے۔ کہیں ڈرون حملے، کہیں مسجدوں، درگاہوں پر حملے ہو رہے ہیں۔ انھیں کون روک سکتا ہے۔“(۹)

آپ بیتی میں فرخندہ بخاری پاکستان کی دگرگوں سیاسی صورت حال سے خوش نہیں ہیں اور ان کی مصائب و مشکلات سے بھرپور اس روداد حیات میں بطور ایک مخلص اور جاں نثار سیاسی کارکن کے وہ مطمئن نہیں ہیں، کیوں کہ ان کی بے لوث سیاسی قربانیوں کو وہ پذیرائی نہیں ملی، جس کی وہ اور ان کے شوہر شہرت بخاری حق دار تھے۔ اس صورت حال کو ڈاکٹر پریز پروازی یوں بیان کرتے ہیں:

> "یہ تو دنیا کا دستور ہے ہی۔ منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔ لے دے کے ان کے شوہر نامدار شہرت بخاری کو بے نظیر کے دور اول میں اقبال اکیڈمی کا ڈائریکٹر بنایا گیا تھا تو یہ عہدہ بھی انکے لئے سانپ کے منہ میں چھچھوندر بن گیا۔ اگلے بنے نہ نگلے بنے۔"(۱۰)

پاکستان میں بار بار مارشل لاء کی وجہ سے ملک کا سماجی ڈھانچہ مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ آمریت پسندوں نے محض اپنے ذاتی مفادات کی خاطر ملکی مفادات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے

معاشرے میں بے حسی، بے روزگاری، مہنگائی، ٹارگٹ کلنگ، اغوا برائے تاوان، راہزنی، دہشت گردی، منشیات کا استعمال، روپے کی بے قدری، بوری بند لاشیں، معاشرتی بدامنی، لسانی امتیازات اور علاقائی تعصبات کا ایسا زہر گھول دیا گیا ہے کہ جانے اس کا اثر کب ختم ہو گا۔ آپ بیتی کے دیباچہ میں شاہد ندیم فرخندہ بخاری کی سرگزشت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "فرخندہ کی خودنوشت "یہ بازی عشق کی بازی ہے" ایک غیر معمولی دور کی غیر معمولی کہانی ہے جو بہت سے سربستہ رازوں سے پردہ اُٹھاتی ہے اور ۷۰ء اور ۸۰ء کی دہائیوں میں اُبھرنے والی جمہوری لہر کے محرکات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔"(۱۱)

مختصر یہ کہ زیر مطالعہ خودنوشت "یہ بازی عشق کی بازی ہے" ایک سادہ گھریلو خاتون کی داستان حیات ہے، جو لاہور میں اپنے گھر میں اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ رہائش پذیر تھی، جس کو حالات و واقعات نے ایک نڈر سیاسی کارکن اور خواتین کے لیے ایسی مثال بنا دیا، جو گھر گرہستی کی ذمہ داریاں نبھاتے نبھاتے، سرفروشی کی تمنا لیے جبر و استحصال کے سامنے ڈٹ گئی تھی۔ بقول ڈاکٹر پرویز پروازی: "فرخندہ بخاری کی یہ خودنوشت کسی سیاسی مدبر کی خودنوشت نہیں ایک عام سیاسی کارکن کی سرگزشت ہے۔"(۱۲)

حوالہ جات و حواشی:

1۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر، پس نوشت (لاہور: نیا زمانہ پبلیکیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص: ۳۴۵

2۔ فرخندہ بخاری، یہ بازی عشق کی بازی ہے (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص: ۱۰

3۔ ایضاً، ص: ۵۴

4۔ شہرت بخاری، کھوئے ہوؤں کی جستجو (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)، ص: ۳۱۳

5۔ فرخندہ بخاری، یہ بازی عشق کی بازی ہے، ص: ۲۰۶

6۔ ایضاً، ص: ۸

7۔ ایضاً، ص: ۱۸۰

8۔ ایضاً، ص: ۲۰۶

9۔ ایضاً، ص: ۲۵۹

10۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر، پس نوشت، ص: ۳۴۳

11۔ فرخندہ بخاری، یہ بازی عشق کی بازی ہے، ص: ۷

12۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر، پس نوشت، ص: ۳۴۵